طاہرہ اقبال اور نیلی بار کی ایک ثقافتی جھلک

سید محمد مبشر رضا نقوی، پی۔ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان
ڈاکٹر محمد خاور نوازش، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان
ڈاکٹر روبینہ ترین، پروفیسر (ریٹائرڈ)، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

ABSTRACT:

Punjab is the land of five rivers as well as five "Bars". Before the advent of canal system, mostly uninhabited area of Punjab was called "Bar" which literally means Forest. The people living in five bars of Punjab had their own distinctive cultural colors. One of these bars, the "Neelibar" is the subject of Dr. Tahira Iqbal's renowned novel "Neeli Bar" published in 2017. This novel deals with Socio political perspective of the said region as well as the diverse colors of the vanishing culture of the region. This article deals with the wedding rituals as an aspect of the Neelibar's culture. From wedding preparations to traditional songs sung at the arrival of the barat, frames of mind of locals and migrants regarding the said occasion, bridal attire and its special preparation including ornaments, departure and arrival of the barat and wedding meals. Here, the complete cultural glimpse of Neelibar marriages ceremonies has been illustrated with examples from Tahira Iqbal's novel.

Key Words:
Punjab, Neelibar, Culture, Wedding, Traditions, Rituals, Marriage, Ceremony

انسان جب سے اس زمین کا حصہ بنا ہے تب سے اس کے مختلف اعمال، رویے، طرزِ فکر اور زندگی کے بارے میں اک خاص نقطہ نظر رہا ہے، جیسے جیسے آبادی میں اضافہ ہوتا گیا اور انسان نے دور دراز سفر کرنے کے لیے مختلف ذرائع تلاش کر لیے تو وہ نئی دنیاؤں سے بھی واقف ہوتا گیا اور جہاں جہاں اس نے قدم رکھے اس خطے کا جغرافیہ، آب و

ہوا، نباتات، اس کی زندگی پر اثر انداز ہوئے۔ ان تمام چیزوں نے اس کے لباس، خوراک اور رہن سہن کا تعین کیا۔ نیز انسان کو جہاں بھی پانی دستیاب ہوا اس نے وہیں پر اپنے ڈیرے ڈال لیے:

> "دنیا کے تمام ابتدائی تمدنوں میں خواہ وہ ایک دوسرے سے جغرافیائی اعتبار سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں، ایک چیز مشترک تھی اور وہ یہ کہ ان سب کی بنیاد زراعت اور آب پاشی پر تھی۔"(1)

اسی لیے ہمیں ابتدائی آبادیاں دریا کنارے نظر آتی ہیں۔ خوراک، لباس اور گھر ہمیشہ سے انسان کی بنیادی ضرورتیں رہی ہیں لیکن یہ تینوں چیزیں جغرافیائی اعتبار سے مختلف نظر آتی ہیں کہ خطے کا موسم جیسا ہوگا، لباس، خوراک اور رہائش گاہیں بھی اسی اعتبار سے زندگی کا حصہ بنیں گی۔ رفتہ رفتہ یہی عناصر جغرافیائی خطوں کی شناخت بن گئے۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی ثقافتوں کو خطے یا جغرافیے، آب و ہوا اور مقامی وسائل نے ترتیب دیا ہے۔ کسی بڑے ادبی فن پارے کی نمایاں خوبی یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے عہد کی تہذیب و ثقافت سے جڑا ہوا ہو یعنی جس خطے کی کہانی بیان کی جا رہی ہو، اسی کی مناسبت سے کلچر کو بھی پیش کیا جائے۔ اردو ناول میں ڈپٹی نذیر احمد سے عہدِ حاضر تک ہمیں بیشتر ناول نگاروں کے ہاں تہذیبی و ثقافتی عناصر کی عکاسی نظر آتی ہے بالخصوص لکھنؤ، دہلی اور حیدر آباد دکن کی ثقافت سے متعلق ہمیں کئی ناول ملتے ہیں۔ اسی طرح پنجاب کے حوالے سے بات کی جائے تو پریم چند سے لے کر عہدِ حاضر میں مستنصر حسین تارڑ اور طاہرہ اقبال تک ہمیں پنجاب کی ثقافت کے متنوع رنگ ملتے ہیں۔

طاہرہ اقبال عہدِ حاضر کی اک ایسی تخلیق کار ہیں کہ جو اپنی دھرتی سے پیار کرنے کو عبادت سمجھتی ہیں۔ وہ جدید دور میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کے تناظر میں پنجاب کی ثقافتی اقدار کو پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے مقامی رنگوں اور بدلتی ثقافتی اقدار کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بالخصوص ان کے دو ناول "نیلی بار" اور "گراں" میں پنجابی رہتل کے متنوع رنگ دکھاتے ہیں۔ کسی بھی خطے کے ان رنگوں میں سے ایک نمایاں رنگ شادی بیاہ کے رسوم و رواج میں نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسی تقریب ہوتی ہے کہ جہاں کسی رہتل کے منفرد اور متنوع رنگ اپنی مکمل جھلک دکھاتے ہیں۔ طاہرہ اقبال کے "نیلی بار" میں متذکرہ ثقافتی رنگوں کی پیش کش بہت عمدگی سے کی گئی ہے۔ انھوں نے "نیلی بار" میں رچناوی تہذیب و ثقافت کے اس پہلو (شادی بیاہ) کے خدوخال کو نہ صرف نمایاں کیا ہے بلکہ اس مٹتی ہوئی تہذیب کو زندہ کرنے کی بھی ایک سعی کی ہے۔ وہ رسومات جو نیلی بار کے علاقے کے مقامی لوگوں سے وابستہ ہیں، انہیں اس مشینی دور نے دھندلا دیا ہے۔ طاہرہ اقبال ان رسومات کی بازیافت چاہتی ہیں۔ ان کے ناول "نیلی بار" میں کل دس ابواب ہیں۔ پہلے باب میں جو "بار کے رنگ، موسم اور لوگ" کے عنوان سے ہے، انہوں نے مقامی

لوگوں کا احوال بیان کیا ہے جو صدیوں سے یہاں آباد ہیں اور پکھی واس، مسلّی، جانگلی اور کمی کمین کہلاتے ہیں۔ انہیں اس سماج میں ادنیٰ اور رذیل سمجھا جاتا ہے مگر طاہرہ اقبال کے لیے یہی لوگ اس کے ہیرو ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شہناز شورو کا کہنا ہے:

> "میرے اور آپ کے سماجی ڈھانچے کی غیر مساوی و بے رحم سانچے میں ڈھلی لغت کے دھتکارے، کولی نسل کی باقیات، دراوڑ، شودر، لوہار، موچی، نائی، کمہار، مزدور، مسلی، گولے، باندے، چرواہے، کسان، ہاری، مزارعے، کمی کمین، رذیل، چوہڑے۔۔۔ نسل در نسل محکومی جن کے خون میں حلول ہو چکی۔۔۔ جو بغاوت کا ذائقہ نہیں جانتے۔۔۔ طاہرہ اقبال کے ہیروز ہیں۔"(2)

انہی مقامی لوگوں کی ایک بارات کی عکاسی "نیلی بار" کی کہانی کے ابتدائی حصے میں موجود ہے۔ یہ کہانی آگے چل کر کئی موڑ لیتی ہے تاہم اس بارات کے پس منظر میں جو مقامی رہتل کی تصویر کشی کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ بارات نیلی بار کی روایت کے مطابق اُن اونٹوں پر آتی ہے جسے ڈاچی کہا جاتا ہے۔ باراتی ناچ رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں۔ انہوں نے تیز رنگوں کے مقامی لباس لنگیاں اور لمبے لمبے کرتے زیب تن کر رکھے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے باراتیوں کا حلیہ کچھ یوں بیان کیا ہے:

> "لال، ہرے، نیلے، پیلے بوچھنوں اور پراندوں میں لپٹی مہندی اور کڑوے تیل کی خوشبو میں رچی رنگ برنگ گٹھڑیاں کچی دھول میں اوندھا گئیں۔۔۔ گہرے گہرے رنگ لپیٹے لڑکی والیاں سٹھنیوں کے زہر میں بجھے گیت کے تیروں سے لیس برات کے استقبال کو بڑھیں۔ باراتنیں اس ناگہانی حملے کے لیے تیار تھیں۔ جوابی سٹھنیوں سے مسلح دفاعی حصار بنا گئیں۔ دونوں دَلوں میں گھمسان کا رن پڑا۔"(3)

اس موقع پر نیلی بار کی خواتین کے روایتی انداز کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ بارات کی آمد پر دلہا اور دلہن دونوں اطراف کی خواتین ایک دوسرے کے مد مقابل آ کر گیت گاتی ہیں اور ان گیتوں میں طعنے، طنز اور گالیاں تک ہوتی ہیں۔ ایسے گیتوں کو "سٹھنی" کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے عابد کمالوی کا کہنا ہے:

> "شادیوں میں سہرا بندی اور مہندی کے گیتوں کے علاوہ "سٹھنی گیت" دلہن والوں کی طرف سے دلہا والوں سے موازنہ کرتے ہوئے گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں میں بظاہر تو طنز ہوتا ہے لیکن اس طنز میں خونی رشتوں کی بے پناہ محبتیں اٹھلا رہی ہوتی ہیں۔"(4)

طاہرہ اقبال نے "نیلی بار" میں ایسے کئی مناظر بیان کیے ہیں جن میں دونوں اطراف کی خواتین ایک دوسرے کو ایک ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے جھانپڑ برسا برسا سٹھنیاں گاتی ہیں۔ مثال دیکھئے:

"میرے پیر دیئے نی جتی ایئے
گل کر مطلب دی بکواس نہ کر کُتیے"(5)

یہ اس علاقے کی مقامی خواتین کا روایتی انداز ہے۔ اس حوالے سے ظفر اقبال کا کہنا ہے:

"نیلی بار کے سبھی رنگ ڈھنگ، موسم، فصلیں، گیت اور ماہیے خصوصاً عورتوں کی نفسیات، چوہلیں، باہمی لڑائیاں، سٹھنیاں، لوک کہانیاں اور لوک دانش، ایک خزانہ محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی مٹتی ہوئی تہذیب، رنگ اور طرزِ بود و باش کی تفصیلات و جزئیات موجود ہیں جن پر اب جدت کا رنگ آرہا ہے۔"(6)

"نیلی بار" مقامی لوگوں کی اُس ثقافت کی پیش کش ہے جو اس خطے میں مہاجروں کے آنے کے بعد معدوم ہونے لگی ہے اور جس کا حقیقی رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ مہاجروں کے نزدیک یہ مقامی لوگ چوہڑے، مسلّی اور جانگلی ہیں۔ تاہم مقامی باشندے اُس ماحول میں اپنے آپ کو مطمئن سمجھتے ہیں۔ انہیں مہاجروں کے تہذیبی رکھ رکھاؤ سے کوئی غرض نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب مقامی لوگوں کی بارات آئی اور سٹھنیوں کا مقابلہ ہوا تو پناہ گیر عورتیں سب کام کاج چھوڑ کر انہیں دیکھنے کے لیے دوڑی چلی آئیں۔ طاہرہ اقبال نے بار کی مہاجر عورتوں کا اس موقع پر رویہ دکھایا ہے کہ وہ مقامی خواتین کے بے باک رویے کو تنقید کا نشانہ بناتی ہیں کیونکہ وہ خواتین اپنی آزاد روی اور جنسی بے باکی کی بنا پر کسی کو خاطر میں لائے بغیر اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہیں:

"ادھیڑ عمر اور بوڑھیوں نے انگارہ رو گالیوں اور فحش جملوں کے تبادلے میں مردوں کے بھی منہ پھیر دیے۔ پناہ گیر عورتیں کانوں کی لویں چھوتی ہوئی گھونگھٹوں کی اوٹ لے، سرخ روتپتے کان لپیٹ کر پلٹ گئیں۔
ہائے نی گندے چوہڑے مسلّی! نہ دین اسلام کا پتہ نہ شرم وحیا۔"(7)

ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ ہی ایک ایسی تقریب ہے جہاں ثقافتی تنوعات کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اگرچہ اس میں بھی جدت آتی جارہی ہے تاہم دیہی علاقوں کے لوگ اب بھی اپنی ثقافتی روایات سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ ان روایات کی بجاآوری میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بار

کے مہاجر لوگ ان مقامی لوگوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے اور غیر مہذب کہتے ہیں تب بھی وہ اس کا برا نہیں مناتے۔ ان کی طبیعت ایسی باتیں سننے کی عادی ہو چکی ہوتی ہے۔

"نیلی بار" میں طاہرہ اقبال نے "گھڑولی" کی رسم کی وضاحت بھی نہایت تفصیل سے کی ہے۔ ہمارے یہاں آج کل یہ رسم معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ مصنوعی روشنیوں کی چکا چوند نے ایسی رسوم کو دھندلا دیا ہے۔ ہمارے دیہی علاقوں میں بھی اس رسم کو اب نہیں ادا کیا جاتا۔ بہت کم لوگ گھڑولی کی رسم کو ادا کرتے ہیں۔ گھڑولی دراصل ایسی رسم ہے کہ جس میں سات سہاگنیں، سات پانیوں سے ست رنگے روغن والی گھڑولی کو بھرتی ہیں اور ساتھ ساتھ گیت گاتی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ گیت دیکھیے:

"تیری گھڑولی بھرن چاچیاں تے تائیاں
تیری گھڑولی نوں لگیاں ست لڑیاں
تیری گھڑولی بھرن سکھیاں تے سہیلیاں
تیری گھڑولی نوں لگیاں ست پھمنیاں
تیری گھڑولی بھرن ماسیاں تے پھپھیاں
تیری گھڑولی نوں لگیاں ست پھولیاں"(8)

یہ گیت، یہ رسمیں اب بھولی بسری داستان لگتی ہیں اور طاہرہ اقبال اسی بھولی بسری داستان کی بازیافت چاہتی ہیں۔ وہ ان گیتوں میں چھپے جذبات کو بیان کرنا چاہتی ہیں جو حقیقی اور پیار بھرے جذبات ہیں، جن میں ریاکاری، تصنع اور دکھاوا نہیں بس چاہت، اپنائیت اور خلوص پنہاں ہے۔ دراصل یہ گیت ہی کسی بھی علاقے کی ثقافت اور جذبات کے اظہار کا موثر ذریعہ ہوتے ہیں۔

طاہرہ اقبال نے گھڑولی بھرنے والی خواتین کے لباس کی بھی عکاسی کی ہے۔ گھڑولی بھرنے والی خواتین لال، پیلے، ہرے شوخ بوچھنوں میں لپٹی، ہری نیلی کنی والے لاچوں کو لہراتی، فقرے بازی کرتی، لڑکیاں اور عورتیں گیت گاتی جا رہی تھیں۔ یہ بے فکر اور آزاد منش خواتین اپنی ذات میں مگن تھیں اور قہقہے اڑاتی جا رہی تھیں۔ اس موقع پر طاہرہ اقبال نے نیلی بار کی تمام خواتین کا موازنہ حویلی میں "مقید" بختاور سے کیا ہے جو کہ ملکانی ہے اور اسے باہر کے ماحول میں آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اُسے اپنے جذبات اور احساسات کے اظہار کی بھی آزادی نہ ہے۔ طاہرہ اقبال نے بختاور کے جذبات کو بیان کرتے ہوئے اس کا موازنہ نیلی بار کی لڑکیوں سے یوں کیا ہے:

"یہ بار کے بکھیر و جنہیں ہنسنے بولنے کی کھلی اجازت ہے۔ باہر کی دنیا دیکھنے پر کوئی پابندی نہ تھی جو دن بھر کھیتوں گلیوں میں مردوں کی طرح گھومتی تھیں۔ جو کھلے بندوں عشقیہ گیت گاتیں اور گالیاں بکتی تھیں۔۔۔ان میں سے ایک کی آج گھڑولی بھری جارہی تھی جو بختاور کے ساتھ بچپن میں گڈیاں پٹولے کھیلتی رہی تھی، لیکن جس کی گھڑولی دیکھنے کی بھی اسے اجازت نہ ملی تھی۔۔۔ یہ لڑکیاں جو باہر حلق پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھیں، قہقہے اچھال رہی تھیں کتنی خوش، کتنی آزاد، سب اس کی نوکرانیاں اور وہ ملکانی، بختاور نے ٹھنڈی آہ بھری، آنسو پنکھڑی سے ملائم گالوں پر ٹپکے، کاش وہ بھی نوکرانی ہوتی تو کھلی فضاؤں میں سانس لینے کی اسے اجازت ہوتی۔ وہ گھڑولی بھرتی، اس برات کے ساتھ باہر نکل جاتی۔ وہ بھی لکھاں بکھاں ہوتی۔"(9)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طاہرہ اقبال نیلی بار کے دو مختلف طبقات کے طرزِ بود و باش اور ان کے جذبات کی عکاسی کر رہی ہیں۔ بالادست طبقہ جسے ہم دیہی معاشرے میں ہر موقعے پر کرتا دھرتا سمجھتے ہیں، اپنی خواتین کو چار دیواری سے باہر نہیں جانے دیتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اُن کی عورتیں باہر کی دیگر عورتوں کی طرح آزادانہ گھوم پھر نہ سکیں بلکہ اپنے فطری جذبات کو بھی اپنے اندر دبا کر زندگی گزاریں۔ طاہرہ اقبال نے بختاور کے کردار کے ذریعے اس کے ملکانی کے روپ کو اس کی اپنی ذاتی خواہشات پر ایک پردہ اوڑھے دکھایا ہے۔ اس کی آواز حویلی سے باہر نہ جائے، اس کی خواہشات اور حسرتیں اُس کے سینے میں ہی دفن ہو جائیں۔ یہاں بختاور ان دبے ہوئے جذبات کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے کہ بیشتر جاگیرداروں کی یہی روش ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواتین کو بنیادی حقوق سے بھی محروم رکھتے ہیں اور اک احساسِ تفاخر کو بنیاد بنا کر انہیں دیگر مقامی عورتوں سے دُور رکھا جاتا ہے خواہ موقع شادی کا ہو یا کسی بھی خوشی کا۔ اگرچہ یہاں تو شادی کے موقع کی بات ہو رہی ہے اور اس موقع پر بھی انہیں اجازت نہیں ہوتی کہ عوام کی خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔

گھڑولی کا منظر قلمبند کرنے کے بعد انہوں نے مقامی دلہن کی تیاری کے مراحل کو بھی بیان کیا ہے کہ سات جگہوں سے بھری گھڑولی کے پانیوں سے چلو بھر بھر کر دلہن کو نہلایا گیا اور سب نے کہا کہ روپ چڑھ آیا ہے۔ غرض دلہن کی خوبصورتی کو لے کر وہ عورتیں چٹخارے لینے لگیں۔ دلہن کی تیاری کے بیان میں طاہرہ اقبال کا اس علاقے سے اپنا تعلق اُن کے مشاہدے کو مہمیز دیتا نظر آتا ہے کیونکہ وہ دلہن کو تیار کرنے کے عمل میں ہر جزو کو بیان کرتی ہیں اور مقامی رہتل کے تمام پہلو ہمیں دکھاتی ہیں۔ یہی ان کی خوبی ہے کہ وہ رسومات جو اَب قصۂ پارینہ بنتی جارہی ہیں، وہ ان کو اہمیت دیتی ہیں:

"اب لال کنی اور ہری ڈبی والے لاچے پر سرخ لیڈی ہملٹن کا لمبا کرتا اور چھوٹی نوک والا خوشابی کھسہ دلہن کو پہنایا گیا۔ مہندی رنگ رچ رچ تلوؤں اور ہتھیلیوں کو نسواری بنایا گیا۔ پیروں کی درمیانی انگلیوں اور انگوٹھوں میں گھنگریوں والے چھلے چھن چھن چھنکتے، چاندی کے پازیب، کلیجی مائل رنگت والی مہندی رچی انگلیوں میں پیچھے دو دو سادہ اور آگے ایک ایک گھنگریوں والا چاندی کا چھلا چڑھایا۔ گلے میں لال ڈورے میں پرویا سونے کا انعام، ماتھے پر گول گھڑت کا ٹیکہ، بھرے بھرے سینے پر پھیلا چندر ھار جس میں چاندی کے گول روپے پروئے تھے۔ ستاروں جڑی لال ساٹن کی تیکھی بنیان پر کھلا ڈھلکتا لال چولا، لمبی لمبی ڈب والا ہر الال لاچا۔"(10)

اس اقتباس میں ہمیں نیلی بار کے علاقے کے وہ تمام رنگ نظر آتے ہیں جو شادی کو رنگا رنگ بنا دیتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فلم ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی ہے، کوئی متحرک تصویریں ہیں جو ماحول کو رنگین بنا رہی ہیں۔

شادی بیاہ کی کوئی بھی تقریب، خواہ وہ اعلیٰ طبقہ کی ہو یا ادنیٰ طبقہ کی، اپنے کھانوں کے حوالے سے بھی امتیازات رکھتی ہے۔ ہر علاقے کی ثقافت کے اعتبار سے وہاں کے پکوان بھی منفرد ہوتے ہیں۔ ہمارے پنجابی دیہی کلچر میں کھانے پینے کے انداز بھی جغرافیائی خطوں کی تبدیلی کے ساتھ اپنے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ وہ علاقے جو دریا کے قریب واقع ہوتے ہیں، وہاں ایسے پکوان زیادہ ملتے ہیں جو چاول سے بنے ہوں۔ طاہرہ اقبال نے بارات کے آنے کے بعد کھانے کا جو منظر پیش کیا ہے، اس میں نہ صرف نیلی بار کا عمومی رنگ نظر آتا ہے بلکہ کھانے کے مقامی انداز بھی نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ کسی تہذیب اور رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں بلکہ اپنی آزاد فطرت کا اظہار زندگی کے ہر شعبے میں کرتے نظر آتے ہیں اور کھانے کے ساتھ ساتھ لڑکوں اور لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ بھی جاری رہتی ہے اور کوئی روک ٹوک بھی نہیں ہوتی:

"باہر شور، ہنگاموں، آوازوں اور ٹاپوں سے گونجتے احاطے میں رات کا کھانا چُنا جا رہا تھا۔۔۔ بڑی بڑی پراتیں گڑ والے چاولوں کی بھر بھر کر باراتیوں کے سامنے رکھی جا رہی تھیں۔ نوجوان مرد تانبے، پیتل کی چترکاری والی پراتیں، ملگجے اندھیرے میں رکھتے اور گہرے گہرے رنگوں کے گھاگروں اور لمبی چولیوں میں کنواریوں کے بوٹی بوٹی دھڑکتے پنڈے کی چٹکیاں لے لیتے۔ وہ لذتِ درد سے دوہری تہری ہو گالیوں کے جھانپڑ لے اُٹھتیں۔

چھور کمینہ دل لئی ویندا ہے
قولاں دا جھوٹا دکھ دیتی ویندا اے" (11)

یہ نیلی بار کا وہ بے باکانہ انداز ہے جو طاہرہ اقبال اپنے قاری کو دکھانا چاہتی ہیں تاکہ ہم بار کی ثقافت کے تمام رنگوں سے آشنا ہو سکیں۔ یہ لوگ خوشی کے موقع پر گڑ کے چاول کھا کر بھی مطمئن ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی خواہشات انتہائی محدود ہیں۔ وہ بار کے درختوں سے توڑ توڑ کر پھل اور سبزیاں کھاتے ہیں اور ان کی شادی بیاہ میں کھانے کی کئی قسمیں نہیں ہوتیں۔ ان کا فطری میلان انہیں کسی اور طرف نہیں جانے دیتا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ جب کوئی خوشی کا موقع آتا ہے تو اُسے حقیقی خوشی کی طرح مناتے ہیں جو اس سماج سے وابستہ ہوتا ہے۔ بار کے لوگ جب بارات لے کر واپس جاتے ہیں تو اپنی حیثیت اور موسم کی مناسبت سے کھانے پینے کی کچھ چیزیں ساتھ لے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ راستے میں آنے والے علاقوں سے بھی کھانے پینے کی چیزیں مانگ لیتے ہیں۔ وہ لوگ نہ صرف کھانے پینے کو دیتے ہیں بلکہ دلہن کو بھی بطور تحفہ کچھ نقدی یا جنس کی صورت میں دے دیتے ہیں۔

نیلی بار کے لوگوں کا یہ دستور ہے کہ بارات صبح سویرے روانہ ہوتی ہے تاکہ دوپہر کی گرمی کی تپش سے محفوظ رہ سکیں۔ وہ اپنے ساتھ سادا خوراک لے کر جاتے ہیں جو ان کا خاص کلچر ہے۔ یہ لوگ کپاس کی چھڑیاں جلا کر تنوروں میں روٹی بناتے ہیں۔ ایسے ہی ایک منظر کی عکاسی طاہرہ اقبال یوں کرتی ہیں:

"گندم کی موٹی موٹی آدھ آدھ کلو پیڑے کی روٹیاں تنوروں سے لگیں۔ لال نیلی ڈبی والے کھیسوں میں باندھیں ساتھ گڑ کی بھیلیاں، پیاز کے گنڈے اور ڈیلوں لسوڑوں کے اچار کی پوٹلیاں باندھیں پانی کے مشکیزے بھر کجاووں کے ساتھ لٹکائے، قافلے کی رخصتی کی تیاریاں اک شور اور ہنگامے کے ساتھ مکمل ہونے لگیں۔"(12)

بارات اگر دُور کی ہو تو وہ راستے میں پڑاؤ بھی ڈالتی جاتی ہے تاکہ سفر کے دوران سورج کی تمازت سے بچ سکیں۔ سورج جب آگ برسانے لگتا ہے تو یہ بارات کسی سایہ دار درختوں کے جھنڈ میں یا کسی بھی سایہ دار جگہ پر رک جاتی ہے تاک آگ دہکاتے سورج سے بچا جا سکے۔ دوپہر کو یہ لوگ اونٹوں سے اتر کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں ۔اس کی منظر کشی کچھ یوں کی گئی ہے:

"دگرد گرقدموں، زبانوں اور حرکات و سکنات کا اک شور اٹھا۔ تڑکے کی پکی ہوئی آدھ آدھ سیر کی روٹیاں اور گنڈے اچار کی پوٹلیاں کھلیں، ہاتھوں کے پیالے میں دھر کر سبھی بڑے

بڑے نوالے گالوں میں ٹھونسنے لگے اور قریبی بستی سے مانگی گئی لسی کے بڑے بڑے گھونٹوں کے ساتھ نگلنے لگے۔"(13)

یہی وہ انداز ہے جو طاہرہ اقبال دکھانا چاہتی ہیں۔ یہ نیلی بار کا وہ طرزِ بود و باش ہے جس کا مشاہدہ کیے بغیر اُسے اتنی تفصیل سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بار کے لوگ جب بارات لے کر واپس جاتے ہیں تو بار کے جس علاقے سے بارات گزرتی ہے تو وہاں کے لوگ دلہن کو دیکھنے کے لیے دوڑے چلے آتے ہیں۔ جس طرح شہری علاقوں میں جب دلہن کسی گھر میں یا کسی رشتہ دار یا جاننے والے کے ہاں پہلی مرتبہ جاتی ہے تو وہ لوگ منہ دکھائی کے طور پر اُسے پیسے یا کوئی تحفہ دیتے ہیں۔ اسی طرح بار کے لوگ بھی رسماً یہ تحفہ دیتے ہیں مگر اس میں کوئی رکھ رکھاؤ یا کوئی تکلف نہیں برتا جاتا بلکہ لوگ جس کیفیت میں بھی ہوں اسی میں ہی میل ملاپ کرتے ہیں۔ بار کے لوگوں کا انداز انتہائی عوامی اور اپنائیت بھرا ہوتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے بار کی مقامی اور مہاجر خواتین کے دلہن دیکھنے میں دلچسپی کو اس طرح بیان کیا ہے:

"راستے میں پڑنے والی ہر بستی، ہر بہنی، جھوک میں چرخہ کاتتی، پونیاں ولورتی، بیلنے پر روئی کو بنولے سے الگ کرتی مہاجر نیں دلہن دیکھنے دوڑی چلی آتیں۔ پلو کنارے بندھا پیسہ دو پیسہ سلامی دیتیں۔ اونٹوں کی ٹلیاں اور گھنگروں کی آوازیں سن کر راجباہوں اور کھالوں کے کناروں کپڑے کوٹتی، کھار اُبال کر موٹے لمبے سیاہ جھاڑ سے بال دھوتیں اور راکھ مل مل نہاتی مصلنیں، جانگلیانیاں اونٹ بٹھوا کر دلہن دیکھتیں۔"(14)

اس اقتباس کا تجزیہ کیا جائے تو دو مختلف تہذیبی رویے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک بار کے مقامی لوگوں کا اور دوسرا وہاں پر آکر آباد ہونے والے مہاجروں کا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مہاجر خواتین نے جونہی دلہن کو دیکھا تو فوراً اپنے دوپٹے کے پلو سے بندھے پیسے نکال کر اسے بطور منہ دکھائی دیے۔ یہ وہ تہذیبی رویے ہیں جن سے بار کے مقامی باشندے آشنا نہ تھے۔ اسی اقتباس میں دیکھیے کہ جب مقامی خواتین بارات کو گزرتے دیکھتیں تو فوراً اونٹ بٹھوا کر دلہن کے کپڑے دیکھتیں، اس کے زیورات کے وزن کو جانچنے کی کوشش کرتیں۔ اس حرکت میں ان کی اپنی بہت سی خواہشات کی عدم تکمیل بھی نظر آتی ہے۔ طاہرہ اقبال نے بار کی ثقافت کے اس پہلو کو نہایت مستعدی اور فنی چابکدستی کے ساتھ دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں انہیں اپنے اسلوب کی بہت مدد حاصل رہی ہے۔ انہوں نے مقامی رسوم و رواج کی عکاسی کے لیے نیلی بار کی ہی زبان کا سہارا لیا ہے۔ ثقافت دراصل انہی رنگوں کے امتزاج کا نام ہے۔ نیلی بار کی رہتل کو طاہرہ اقبال نے انہی کی زبان کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے شادی کے موقع کی مناسبت سے مقامی بولیاں، لوک گیت

وغیرہ کا نہ صرف بر محل استعمال کیا ہے بلکہ مختلف کرداروں کے حوالے سے مختلف مقامی لسانی حوالے بھی استعمال کیے ہیں:

"ہائے نی سوہنی تے سونکھڑی، نی راوی دا سرا، نی بار دا سنگار۔۔"(15)

ایک اور مثال دیکھیے:

"نی اے انعام کتھوں گھڑوایا نیں، نی تو لے دا تے ہوسی نی، اے لونگ ڈاہڈا پیا سجدا اے،
ہیں نی پٹولے وانگ تے کڑی اے سجے کیوں تا۔۔۔"(16)

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ طاہرہ اقبال نے بار کی ثقافت کے ہر رنگ کو اک الگ انداز سے دیکھا ہے۔ انہوں نے مقامی لوگوں کے طرزِ بود و باش کی مناسبت سے ان کی زبان اور بولیوں کو پیش کیا ہے۔ یہ تمام رنگ مل کر نیلی بار کی ثقافتی زندگی کا اک دلکش مرقع بناتے ہیں۔ چونکہ طاہرہ اقبال کا بنیادی تعلق بھی اِسی علاقے سے ہے لہٰذا انہوں نے اپنے مشاہدے کو تخلیقی تجربے کا حصہ بناتے ہوئے مقامی لوگوں کی شادی بیاہ کے رنگ کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اُن کے بیان سے آنکھوں کے سامنے ایک فلم چلنے لگتی ہے جس کا ہر منظر، ہر رنگ، منفرد اور تصنع سے پاک ہے۔ یہی طاہرہ اقبال کے ناول "نیلی بار" کا نمایاں وصف بھی ہے۔ اگرچہ اس ناول میں انہوں نے دیگر سیاسی اور سماجی واقعات کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے تاہم وہ تمام پہلو اس بنیادی ثقافتی رنگ سے مربوط ہیں۔ بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات اور واقعات نے نیلی بار کے حقیقی رنگ کو دھندلانا شروع کر دیا ہے اور طاہرہ اقبال کا بنیادی مطمع نظر انہی رنگوں کی بازیافت ہے۔ ڈاکٹر سجاد نعیم کا کہنا ہے:

"کسی علاقے کی ثقافت وہاں کے باشندوں کی نفسیات، میلانات اور زندگی کے بارے میں
شعور کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ اپنے مظاہر کے خطے کی شناخت کا حوالہ بنتی ہے۔"(17)

طاہرہ اقبال نے اپنے تخلیقی تجربے، علم اور مشاہدے کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک ایسا ناول تخلیق کیا ہے جو آنے والے لکھاریوں کے لیے بھی اک راہ متعین کرتا ہے کہ کس طرح تخلیقی تجربہ کسی بھی خطے کے متنوع رنگوں سے مربوط ہو کر ثقافتی دستاویز بن جاتا ہے۔ ناول ہی اک ایسا ذریعۂ اظہار ہے جو اپنے قاری تک کسی بھی خطے کی ثقافت کے تمام رنگوں کو موثر اور واضح طور پر پہنچا سکتا ہے۔

حوالہ جات:

1۔ عزیز احمد، نسلِ انسانی کی تعریف،(لاہور: اپنا ادارہ، 2004ء)، ص14

2۔ شہناز شورو، نیلی بار۔ میرا دیس نیلوں نیل، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، 2019ء)، شمارہ123-124، ص198

3۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2017ء)، ص11

4۔ عابد کمالوی، پنجاب کی ثقافت، (ملتان: بزمِ ثقافت، 2007ء)، ص38

5۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص12

6۔ ظفر اقبال، نیلی بار: طاہرہ اقبال کا نیا ناول، مشمولہ: روزنامہ دنیا، (ملتان: 27/اپریل 2017ء)

7۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص18

8۔ ایضاً، ص22

9۔ ایضاً، ص23

10۔ ایضاً، ص24

11۔ ایضاً، ص26

12۔ ایضاً، ص32

13۔ ایضاً، ص35

14۔ ایضاً، ص35

15۔ ایضاً، ص35

16۔ ایضاً، ص35

17۔ سجاد نعیم، چناب کنارے، (لاہور: فکشن ہاؤس، 2021ء)، ص22۔23